# ایک گلاب

از

رفعت سراج

## ناول کا آغاز

حالانکہ آج تو میں معمول سے لیٹ ہو گیا تھا۔سگنل پھر بھی سرخ ہی ملا تھا۔جیسے یہ میرے نصیب کا حصہ ہو۔جسے ضرور ہونا ہو۔

میں نے بیک ویو مرر میں نظر ڈالی تو پیچھے گاڑیوں کا ہنگم محشر برپا تھا اور اسی طرح میرے آگے بھی کافی گاڑیاں تھیں۔

سخت کوفت ہوتی ہے۔گاڑی کی رفتار نہیں ٹھہرتی، گویا ایک تخیلاتی دنیا درہم برہم ہو جاتی ہے۔

جیسے کہ اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی میں۔۔۔آنے والے چند گھنٹوں کا بک کر چکا تھا۔گھر تک کے سفر کا دورانیہ غسل، چا، ہمدانی صاحب کی فائل۔

آئی جی صاحب کے پیاے کو بہت ضروری فون، پھر رات نو بجے ظفر کے ہاں کھانے پر مجھے ایک دم احساس ہوا۔

ان تمام کاموں میں وہ کہیں فٹ نہیں تھی۔کیا وہ ظفر کے ہاں میرے ساتھ کھانے پر بھی نہیں جا سکتی؟

صاحب جی تازہ موتیے کے گجرے ہیں۔لے لیں۔

میرے برابر والی سیٹ خالی تھی، پھر یہ گجرے بیچنے میرے پاس کیوں چلا آیا۔

میں گجرے نہیں پہنتا۔میرے اعصاب تنے ہوتے تھے۔اس لیے خشک انداز میں جواب دے کر سگنل دیکھنے لگا۔



صاحب جی بیگم صاحبہ کے لیے لے جائیں۔شام کا ٹیم ہے۔خوش ہو جائیں گی۔

میں نے ابھی ایک نگاہ غلط بھی اس آواز کی طرف نہیں ڈالی تھی۔انتہائی تعجب سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔بمشکل دس گیارہ سال کا بچہ تھا۔انتہائی گھسے ہو مگر صاف ستھرے کپڑے پہنے تھا۔بال بھورے تھے یا شاید دھوپ نے ان کی سیاہی چھین لی تھی۔بڑی بڑی نیلی آنکھیں۔

آنکھیں۔۔۔عجیب سی یاسیت جن کی بنیاد تھی۔

کہانیاں سناتی ہوئی آنکھیں۔۔۔

اسی دم سگنل زرد ہو کر سبز ہو گیا۔گاڑیوں کا ٹھہرا ہوا سمندر گویا ابلنے لگا۔میں نے بھی گاڑی فورا آگے بڑھا دی تھی۔

اسکی آنکھیں بہت غیر معمولی تھیں۔

یا شاید تاثرات غیر معمولی تھے۔

چوبیس گھنٹوں میں سیکڑوں لوگ ملتے ہیں۔مگر حافظے کی اسکرین پر نقوش یوں ثبت نہیں ہوتے جیسے مجھے اس کی آنکھیں زبانی یاد ہو گئی تھیں۔

بیگم صاحبہ کے لیے لے لیں۔اس کی مہین دودھ سے مہکتی ہوئی آواز مجھے پھر یاد آئی۔

ہونہہ بیگم صاحبہ میرے وجود میں جیسے انگارے سلگ اٹھے تھے۔

گاڑی پورچ میں پہنچی اور ٹیرس پر میں نے آنچل کی سرسراہٹ محسوس کر لی۔ایک عجیب سے احساس کے تحت میرے قدم مزید سست ہو گئے۔

اپنے بیڈ روم میں داخل ہو کر میں نے ماحول کی سرد مہری محسوس کی اور اپنے معمولات میں
مصروف ہو گیا۔

نہا کر باہر آیا تو کمرے میں چوڑیاں ساز چھیڑ رہی تھیں۔ میں نے انتہائی کوشش کے بعد خود کو
اس کی طرف دیکھنے کے لیے تیار کیا۔

چا یا کھانا؟ دھانی سوٹ میں ملبوس وہ پہلے بجاتی ہوئی اپنے نمکین چہرے کے ہمراہ پھر میرا دکھ
بڑھانے لگی۔

چا۔۔۔کھانا آج ظفر کے ہاں ہے۔ میں نے رسانیت سے جواب دیا۔ اگر دل چاہے تو تم
بھی چلو۔ میں نے پھر اس کا چہرہ ٹٹولا۔

اس نے مجھے دیکھتا پا کر پھر اپنی پلکوں کی جھالر گرالی تھی۔

میں کیا کروں گی جا کر۔۔۔آپ تو۔۔۔

کیا آپ تو۔۔۔؟ میں نے سوال کیا۔

کچھ نہیں، میں چا بھجوا دیتی ہوں۔ وہ تیزی سے پھر باہر نکل گئی تھی۔

ایک تو ظالم کا چہرہ بھی ایسا ہے کہ خود بخود میرا لہجہ نرم ترین ہو جاتا ہے۔ ورنہ بعض اوقات جی تو
یہی چاہتا ہے کہ بےنقط سنا کر دل کا سارا غبار نکال ڈالوں۔

وہ چا لے کر آئی تو میں۔ آئی جی صاحب کے پی اے کو فون کرنے میں مصروف تھا۔ اور بیڈ پر
بےتکلفی سے دراز تھا۔ اس نے چا کا سامان تپائی پر رکھ کر ایک موڑھا گھسیٹ کر تپائی کے قریب



کیا اور بیٹھ گئی۔۔۔یہ اس کا انداز تھا۔

حالانکہ بیڈ پر اتنی جگہ خالی تھی۔ مگر غیریت کا تاثر جو اس نے بہر طور دینا تھا۔ میرا جی مکدر ہوا۔
اسے کس چیز کی کمی ہے۔

مجھے یہاں کس چیز کی کمی تھی جو میں سرحد پار سے بیاہ کر لایا؟ اگر دیکھا جاتا تو اسے خوشی سے مگن رہنا
چاہیے۔ نقوش و رنگت سے تو میں اہل یورپ سے ہی متعلق۔۔۔۔نظر آتا ہوں پھر معاشی لحاظ
سے بھی اللہ کا بیحد احسان ہے۔

رات کے بارہ بجے تک واپسی ہو گی۔ ڈرو گی تو نہیں؟ میں نے ریسیور رکھ کر یونہی پوچھ لیا۔

اب تو عادت ہو چکی ہے۔ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

دل چاہتا ہے، کبھی تمہاری پٹائی کر ڈالوں؟ یہ اس کی معصومیت پر میرے پیار کا بیاختیار اظہار
تھا۔ اس نے شکر ملاتے ملاتے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ مگر کوئی تاثر نہیں دیا۔

ایسے کون سا میں راتوں کو دیر سے آتا ہوں؟ آپ کو عادت ہو چکی ہے؟ میں نے دریافت کیا۔

اکثر تو ایسا ہوتا ہی ہے مگر میں اعتراض تو نہیں کر رہی ویسے ہی کہہ رہی تھی۔

اپنی ساس نندوں سے فون پر باتیں کر لیا کرو۔ اگر بور ہو رہی ہو۔ اور یوں بھی میری موجودگی میں
تو تم بور ہی ہوتی ہو۔ پابندی سی ہو جاتی ہو۔ میرا گھر سے باہر رہنا تو تمہارے حق میں بہتر ہی
ہے۔

وہ کپ میرے سامنے رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے پھر کچھ نہیں کہا۔ جب میں پہلی مرتبہ امی

کے ہمراہ ہندوستان کے شہر لکھنؤ گیا تو اس وقت فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔ امی کے رشتے دار تو زیادہ تر لکھنؤ اور بمبئی میں تھے جبکہ والد صاحب صوبہ سرحد کے باسی تھے۔ یعنی آباؤ اجداد روسی ترکستان سے ہوتے ہوتے آخر کار سرحد میں مقیم ہو گئے تھے۔ میرے نانا اور دادا انگریز راج کے زمانے سے دوست بنے تھے۔ (اپنی ملازمتوں کے سبب) اور دوستی کو مضبوط بنانے کے لیے گویا یہ رشتہ ہوا تھا۔

مجھے خود بھی ہندوستان دیکھنے کا خاصا شوق تھا۔ لہٰذا جب امی اپنے میکے جانے لگیں تو میں بصد شوق ہمراہ ہوا۔

میرے ننھیال والے بہت وضعدار و رکھ رکھاؤ والے تھے اتنے خوبصورت ماحول میں میرا خوب دل لگا تھا۔

انہی دنوں یہ محترمہ غالباً ابتدائی پرائمری کلاسز میں ہوا کرتی تھیں۔ اپنی امی کے ہمراہ رام پور شہر کے کسی نواحی علاقے سے تشریف فرما ہوئیں۔ یہ میری سب سے چھوٹی خالہ کی نند تھیں۔ انتہائی سہمی سہمی اور خوف زدہ اعتماد سے قطعی عاری۔

گھر بھر کے اور محلے کے بچے شام کو بڑے سے دالان میں ہلڑ بازی مچایا کرتے تو یہ جا بجا پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔

سب بچے انہیں بہت ستاتے تھے غالباً بچے کسی بچے کو خود سے دبتا دیکھ کر جذبہ حاکمیت کی تسکین محسوس کرتے ہیں۔ ایسے میں اگر میں داخل ہو جاتا تو فوری دادرسی ہو جاتی تھی۔ یعنی بعض



اوقات تو بچوں کی دھکم پیل میں وہ کچے فرش پر گھٹنوں کے بل گری ملتی تھیں۔ چڑیا جیسی معصوم اور دلکش، مجھے اس ظلم پر بعض اوقات اتنا غصہ آ جاتا تھا کہ لگے ہاتھوں موقع واردات پر دو چار جڑ بھی دیتا تھا۔ یوں بھی بچوں میں، میں بڑا بچہ تھا۔ بچے مجھ سے ڈرتے تھے۔ ان کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتا۔ کہنیوں اور گھٹنوں سے خاک جھاڑتا۔ رخساروں پر بہنے والے اشک صاف کرتا۔ میرا ان کے ساتھ رویہ وہی ہوتا جو کسی بڑے کا بچے کے ساتھ ان حالات میں ہو سکتا تھا۔

ان کی انگلی تھام کر چھوٹی خالہ جان کے پاس لا کر ان کی کوتاہی انہیں محسوس کرانے کی کوشش کرتا تو بیزاری سے جواب ملتا۔

تو جاتی کیوں ہیں۔ جا بنا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا۔ انہیں کے پہرے کو رہ گئی ہوں۔ میں تو لا بھی نہیں رہی تھی۔ یہ کہنے لگے چھٹیاں ہیں لے جاؤ۔ اس کا بھی دل بہل جا گا۔

ایسے شریر بچوں کے بیچ کیوں پڑتی ہو؟

اب وہ براہ راست پھٹکارتیں اور چھلے ہو گھٹنوں پر اینٹی بائیوٹک قسم کا پاؤڈر بھی چھڑکنے لگتیں۔ ان کا انداز اپنائیت بھرا نہیں۔ بلکہ رسمی سا ہوتا تھا۔

یہ تو تھے وہ واقعات جو خاصے عرصے پہلے کے تھے۔ دوبارہ جب ہندوستان گیا خاصا کامیاب قانون دان بن چکا تھا۔ پی ایچ ڈی کرنا میرا شوق ٹھہرا تھا۔ لہٰذا تحقیق بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

بڑی بہن اور دونوں چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ حتیٰ کہ مجھ سے چھوٹے خاور کی بھی اسی

کی پسند سے اسی کی کلاس فیلو سے، وہ بی ای انجینئر تھا۔ میری مصروفیات اس قسم کی تھیں اور پھر پتا نہیں کیوں میرا موڈ بھی نہیں بنا تھا کہ شادی کے سلسلے کی طرف متوجہ ہوتا۔

کبھی کبھی مجھے لکھنؤ میں گوارے ہوودن یاد آتے تھے۔ تو ایک ہیولا بھی ذہن میں سرسراتا تھا۔ ظلم ہر صورت۔ میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ یہ میری سرشت تھی۔ شاید اسی لیے میں نے قانون کا انتخاب کیا تھا۔

وہ بچی بڑی یادگار قسم مظلوم تھی۔ پتا نہیں بڑی ہو کر کیا ہوئی ہوگی۔ چھوٹی خالہ کا رویہ مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ ظاہر ہے میں ٹین ایجر میں شامل تھا۔ اس وقت کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہیں تھا۔

میں نے انتہائی ہمدردانہ انداز میں امی کو مشورہ دیا تھا کہ مینا کو اپنے ساتھ پاکستان لے چلیں۔ وہاں ہم اس کو بہت اچھے اسکول میں داخل کرائیں گے۔ اسے لیڈی ڈاکٹر بنائیں گے۔

لو بھلا پرائی بچی اس طرح بھی لے جاسکتے ہیں۔ اللہ رکھے اس کے باپ کو، بھائیوں کو، بچوں کو جو آرام اپنے گھر میں مل سکتا ہے وہ کہیں اور نہیں۔

شاید میں بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ جو امی نے اس قدر۔۔۔ تفصیل سے مجھے سمجھایا تھا۔ اب جب میں لکھنؤ گیا تو یقین کریں میرے ذہن میں مینا کے بارے میں کوئی تصور نہیں تھا۔

وہ تو میرے ماموں جان رام پور جا رہے تھے۔ مجھے بھی دعوت دی کہ ایک دو روز وہاں کی سیر بھی سہی۔

اس بار سب سے پہلے مینا سے سامنا ہوا۔ میں اور ماموں جان جیسے ہی ٹیکسی سے اترے وہی



دروازے میں کھڑی سبزی خرید رہی تھی۔ سولہ سترہ سال کی ایک سادہ سی لڑکی۔

آداب بھائی صاحب اس نے ماموں جان کو فوراً آداب کیا اور میری سمت متوجہ ہو کر خاموش سی ہو گئی۔

ارے بھئی، یہ تمہارے خاص مہمان ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔ یاور علی خان صاحب۔ ماموں نے اظہار اپنائیت کے طور پر میری پیٹھ تھپتھپائی تھی۔

مینا نے خاصے بے نیازانہ انداز میں مجھے آداب کیا اور ہمیں لے کر چلی آئی۔ وہ ننھی منی، دبلی پتلی مینا؟ میرے ذہن میں سوال جاگے۔

کس قدر جاذب اور دلکش نکلی ہے۔ یہی سوچ میرے ذہن میں آئی تھی۔

دراصل پرکشش اور دلکش لگنا اتنا فطری ہے کہ اس کی تشریح نہیں ہوسکتی۔ بعض چہرے بہت مناسب نقوش کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر ایک سے دوسری بار دیکھنے کو دل نہیں چاہتا مگر بعض لوگ بظاہر بڑے عام سے نظر آتے ہیں مگر ان میں غضب کی مقناطیسیت ہوتی ہے۔ دل کھنچا چلا جاتا ہے۔ مجھے مینا انہی میں سے ایک دکھائی دی تھی۔ ہماری عمروں میں اچھا خاصا تفاوت تھا۔

مگر جذبے عمر و زمان اور مکان کی قیود سے بالاتر ہوتے ہیں۔

اور اچھا لگنا ہی محبت کی ضمانت نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود۔۔۔

بس وہ مجھے اچھی لگی تھی شاید اس لیے کہ وہ بہت فطری تھی۔ ایک ایک ادا۔ بول چال۔ لب و

لہجہ، چال ڈھال اور روبرو طرزِ عمل ہر بات فطری تھی۔

موصوفہ تھیں بھی اچھی خاصی سہمی ہوئی شخصیت۔ میری خالہ یعنی اپنی بھابی سے بات کرتے ہووہ بہت بدحواس نظر آتی تھیں۔

آپ کے نام کے اسپیلں (ہجے) کیا ہیں؟ مجھ جیسے خاصے سرد طبع آدمی کو بھی ان کی سادہ لوحی نے شرارت پر مجبور کر دیا تھا۔

کھڑی مٹکے میں پانی انڈیل رہی تھیں۔ آہستگی سے بولیں۔ ایم ڈبل ای این اے۔ آپ کو الہام ہو گیا تھا کہ انگریزی کے ہجے پوچھ رہا ہوں؟ مجھے تعجب ہوا۔

آپ نے اسپیلں کہا تھا۔ وہ پیتل کی بالٹی سمیت آنکھ سے اوجھل ہو گئی تھی۔

لڑکی کم گو ضرور ہے، بیوقوف نہیں۔ میں مسکرا دیا تھا۔ اب ظاہر ہے میری اور مینا کی عمر میں اتنا فرق بھی نہیں تھا کہ خوشگوار جذبہ پیدا نہ ہو سکتا۔ بس وہ مجھے اچھی لگی تھی۔

کیوں؟

اس کیوں پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

اگلے روز مینا کہیں جانے کے لیے خالہ جان سے اجازت مانگ رہی تھی کہ میں سر پر پہنچ گیا۔

بی بی گھر میں مہمان آ ہو ہیں۔ بارات پرسوں آ گی۔ مہندی میں جانا کوئی اتنا بھی ضروری نہیں۔

ٹھیک ہے بھابی جان وہ پلٹی وت مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔



مہمانوں کے کون سا کام آ رہی ہیں۔ جانے دیجیے۔ ویسے مینا آپ نے مجھ سےیہ تو پوچھا نہیں کہ میں آپ کے نام کے اسپیلں کیوں پوچھ رہا تھا۔؟

مرضی ہے آپ کی۔ بیا نتہا سردو زرد پڑتی دکھائی دی۔ جان چھڑاتے ہو بولی تھی۔

مگر سوال پو پیدا ہونا چاہیے۔ آخر آپ باشعور خاتون ہیں۔

میرے ذہن میں سوال پیدا نہیں ہوتے۔ وہ ناراضگی سے گویا ہوئی تھیں۔

خاصا عجیب وغریب ذہن ہے۔ وہ مجھ سے نظریں چراتی تو اتنی دلکش ہو جاتی کہ ہر مثال کم محسوس ہوتی۔

بھئی، میں اس لیے پوچھ رہا تھا۔ آپ اڑانے والی مینا سے ہوتے ہوتے مینا بنی ہیں یا ہیں ہی مینا؟ میں شریر ہوا۔

خالہ جان گھر کی پڑھی ہوئی خاصی عام سی خاتون ہیں۔ وہ اس ذومعنی جملے کو سمجھنے سے قاصر رہیں۔

اور مینا جلدی سے باہر چلی گئی تھی۔

ارے اس لڑکی کے تو چہرے ہی سے مسکینی ٹپکتی ہے۔ روتے کیوں ہو؟ کہا صورت ہی ایسی ہے۔ یہ مثل ہے یہاں تو۔

وہ ہماری دیورانی کہتی ہیں مینا مرے پاس رہو۔ بہت آرام ملے گا۔ جیسے میں اس سے کنویں کھدواتی ہوں کریں دھریں گی خاک بھی نہیں۔ یہ مجھے پتا ہے۔

جیٹھ خاندان سے کٹے ایک طرف بیٹھے ہیں۔ان کی ناک ہی دس بالشت کی ہے۔چالاک ہیں سب۔لڑکی ہمارے سر ڈال دی۔

میاں، میرے سسر کل دس ہزار روپے مینا کے نام کر کے مرے تھے، اللہ بخشے، تم ہی کہو۔دس ہزار میں شادیاں ہوئی ہیں؟

اوہ۔

اب مجھے خالہ جان کے اس کے ساتھ حسن سلوک کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔میں بہت خوبصورت ارادے کیساتھ اس مرتبہ پاکستان لوٹا تھا اور سوچ لیا تھا۔اس مرتبہ امی کے پوچھنے پر مینا کا نام بتا دوں گا۔

ایک مرتبہ امی تڑے اہتمام سے میری شادی کے موضوع پر گفتگو کرنے آئیں۔(میرے کمرے میں) تب میں نے انہیں بتا دیا کہ میں سرحد پار شادی کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔

امی کے استفسار پر میں نے مینا کا نام بتا دیا۔

امی ہکا بکا میری شکل دیکھنے لگی تھیں۔

اتنی دور شادی تو خاصا مسئلہ ہے بیٹے اور پھر مینا؟ اس کی اور تمہاری عمر میں بھی خاصا فرق ہے۔



وہ شاید وہاں میری شادی کرنے پر آمادہ نہیں تھیں۔اپنے طور پر انہوں نے مجھے قائل کرنے کی وشش کی تھی۔

میں فیصلہ کر چکا ہوں۔کوئی مسئلہ نہیں ہے۔آپ خالہ جان کو لکھ دیں۔ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیں کہ ہمیں جہیز وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ایک پیسے کی چیز ہمیں منظور نہیں۔

امی الجھن میں پڑ گئی تھیں۔

سوچوں گی۔وہ یہ کہہ کر اٹھ گئی تھیں۔

مگر مجھے خود پر اعتماد تھا اور یہ یقین تھا کہ حالات میرے حق میں ہو جائیں گے۔

امی نے بہنوں کو بھی بتا دیا تھا۔

وہ سب مجھے سمجھا رہی تھیں کہ یہاں ایک سے ایک لڑکی موجود ہے۔ہم نے تو اس لڑکی کو دیکھا تک نہیں ہے۔وہ ہمارے گھر میں ایڈجسٹ بھی ہو سکے گی یا نہیں؟

میں اسے دیکھ چکا ہوں، یہ بہت ہے۔ایڈجسٹ اسے میرے ساتھ ہونا ہے۔ہو جا گی۔

بالآخر بابا جان سے مشورہ کر کے امی نے خالہ جا کو خط لکھ دیا۔جواب میں خالو جان کا خط آیا تھا۔انہوں نے اس رشتے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔میری حوشی کی کوئی انتہا ہی نہیں تھی۔چشم تصور میں مینا کو اس گھر میں چلتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔

مگر یہ خوشی اس وقت ختم ہو گئی جب خالہ جان کا دوسرا خط آیا کہ مینا کو اس کے بڑے بھائی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔اور وہ ہندوستان سے باہر شادی کرنے پر رضامند نہیں ہیں۔اب تو

اس سے قبل کہ میں کچھ اور بات کرتا۔وہ کمرے سے باہر جلی گئی تھی۔

امی سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ شادی میری ضد کے سبب ہوئی تھی۔ وہ تو الٹا مجھے ہی کچھ سنانے لگتیں۔

ہر شے سے میرا دل اچاٹ رہنے لگا تھا،

صاحب جی تازہ موتیے کے ہیں۔

گاڑی کے رکتے ہی وہ پھر کہیں سے آ وارد ہوا۔ میں جھلا کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔مگر اس کی سمت دیکھ کر جذبات کی کیفیت بدل گئی۔

کتنے کیہیں؟

تین تین روپے کے۔اس کی آنکھوں میں زندگی دوڑنے لگی تھی۔

میں نے اس سے دو گجرے لے کر ڈیش بورڈ پر اچھال دیے۔

تم اتنے چھوٹے سے ہو۔تمہارے گھر میں اور کوئی نہیں ہے کمانے والا؟ اتنے معصوم سے وجود کو معاش کی چکی میں لپتے دیکھ کر میں نے بہت دکھ سے سوال کیا تھا۔

صاحب میں اپنے گھر میں بڑا ہوں۔ آپ لوگ گجرے لے لیتے ہیں تو ہمارے گھر میں دو وقت کی روٹی پک جاتی ہے۔بعض اوقات بکری نہیں ہوتی تو ہمیں نقصان ہو۔

سبز بتی روشن ہوگئی تھی۔ میں نے اسے پیسے تھما کر گاڑی جلدی سے آگے بڑھا دی تھی۔ ساتھ والے ہمسایے جمیل صاحب کا بیٹا اسی کی عمر کا تو ہوگا۔سارا دن اپنی چھوٹی سی بائیکل دوڑاتا



رہتا ہے۔اور اس معصوم پر ذمہ داریاں پہاڑ کی طرح مسلط ہیں۔مجھے افسوس ہوا تھا۔

آپ لوگ گجرے لے لیتے ہیں تو ہمارے گھر دو وقت کی روٹی پک جاتی ہے۔

میرے وجود میں نیلی آنکھوں کے نشتر اترنے لگے۔میرے حساس دل پر اس کا دکھ دیر تک اترتا رہا،

گھر پہنچ کر میں نے کچھ سوچ کر گجرے اٹھا لیے۔

مینا کمرے میں آئی تو خوشبوؤں سے چونک سی گئی۔

تیزی سے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔

آپ لائیں؟ اس کی آواز حیرت سے پر تھی۔

کیا تمہیں اچھے نہیں لگتے؟ میں نے شکستہ اواز میں اس سے دریافت کیا۔

پھول کسے ناپسند ہوسکتے ہیں؟ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

پہن لو۔ میں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

ادھر آؤ۔اسے خاموش دیکھ کر میں نے پھر اپنی انا کو کچلا۔وہ۔۔۔۔قریب آ گئی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے گجرے لے کر اس کی کلائیوں میں سجا دیے۔ میں نے محسوس کیا۔ جیسے مینا کی آنکھیں بھیگ رہی ہوں۔

شکریہ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

محبت کے عمل میں شکریے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔آئندہ یہ مس فٹ چیز کبھی استعمال نہ کرنا۔

محبت؟اس نے نظریں اٹھائیں۔ان میں ازحد استعجاب تھا۔

تم میرے ساتھ ہو۔میری ہو۔تھر کیا ہے یہ؟۔۔۔میں نے دکھ سے کہا۔

میں نے اس کی کلائیاں چھوڑ دیں۔اورکوٹ اتارنے لگا۔وہ باہر نکل گئی تھی۔

پھر یہ میرا روز کا معمول ہوگیا۔

میں اس بچے سے روزانہ کئی گجرے لینے لگا۔اس کے چہرے پر پھیلتی روشنی میری خاموش عبادت کا نور دکھائی دیتی۔جس سے مجھے عجیب سا سرور محسوس ہوتا۔

اب مینا مجھے کمرے میں منتظر ملتی۔

میرا چہرہ دیکھنے کے بجاوہ میرے ہاتھوں کی سمت دیکھتی تھی۔جن میں سفید موتیا اور سرخ گلاب ہوتے تھے۔

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکان ہوتی تھی۔میرے وجود پر سات رنگ اترنے لگے تھے۔میں انتہائی چاہ سے اس کی کلائیوں میں گجرے پہناتا تھا۔اب تو بصد شکر وہ میری کلائیاں تھام لیتی تھی۔جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔

اس کی طرف سے بے تکلفی کا یہ عمل مجھے نئی زندگی دینے لگتا تھا۔مگر میں نے اس سے کبھی کچھ پوچھا نہیں۔

میں چاہتا تھا، وہ خود ہی مجھ سے بات کرے جو کہنا چاہتی ہے، خود ہی کہے۔جب میں اپنا استحقاق استعمال کر کے اس کے ساتھ کوئی لطیف سی شرارت کرتا تو وہ گریز اور بیزاری کے بجا



میرے ہی وجود میں پناہ ڈھونڈتی تھی۔ان گجروں نے خوشیوں کے ہزار در کھول ڈالے تھے۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ صرف پھولوں کے گجرے۔میری زندگی میں انقلاب لے آئیں گے۔تو میں سارے شہر کے پھول گھر میں لے آتا۔

اب مجھے دور ہی سے اس بچے کی تلاش ہوتی تھی۔خواہ سگنل سرخ ہو یا سبز میں چورنگی پر گاڑی ضرور روکتا تھا۔

بیٹے تمہاری دعا میں بڑی تاثیر ہے۔میرے لیے دعا کرو۔میری حوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔

ایک روز میں نے اس کے رخسار تھپتھپا کر کہا تھا اور وہ بھولپن سے مسکرا دیا تھا۔

صاحب بیگم صاحبہ کو گجرے بہت اچھے لگتے ہیں؟آپ اتنے سارے جو لے جاتے ہیں۔

میری گفتگو سے بچے کو جرات ہوئی تھی کہ مجھ سے سوال کر بیٹھا تھا۔

ہاں، بہت پسند ہیں۔شاید مجھ سے بھی زیادہ۔میں کہہ بیٹھا۔

اچھا تم بتاؤ۔تمہیں کیسے پتا چلا کہ میری بیگم صاحبہ بھی ہیں؟میں نے اس کی پیاری صورت کو محبت وشفقت کے ساتھ دیکھا۔

آپ جتنے لوگوں کی بیگم صاحبہ تو ہوتی ہی ہے۔(اس مراد عمر سے تھی)اس نے اپنی دانست میں بڑا مکمل جواب دیا تھا۔

یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔

جی ہاں آخری۔۔۔

اس دن جب اس سے بات کر کے گھر پہنچا تو مینا مجھے حسب معمول کمرے میں ملی۔ والہانہ میرا سواگت کیا۔

جب میں چائے پی رہا تھا تو وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

یاور صاحب (وہ مجھے شروع دن ہی سے یاور صاحب کہتی تھی)

حکم جناب

مجھے آپ سے بہت ساری معافی مانگنا ہے۔

مانگ لیجیے۔ میں نے شرارت سے اسے تنگ کیا۔

اگر بات بہت بگڑ جاتی؟ آپ میرے رویے کے بارے میں مجھ سے سختی سے پوچھ پڑتال تو کر لیتے۔ آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا کیوں نہیں؟

کیا پوچھتا؟ تمہارے انداز میں اتنی دل آزاری ہوتی تھی ہمت جواب دے جاتی تھی۔ تم تو پہلی شب سے ہی۔۔۔ میں رک گیا۔ اسے شرمندہ کرنے کو دل نہیں چاہا تھا۔

یاور صاحب

اوں ہوں، یا تو یاور کہو یا صاحب۔ صرف ایک چیز۔ میں اندر ہی اندر حیران تھا مگر باہر سے مطمئن تھا۔

میرے منہ سے نہیں نکلتا۔ اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ مجھ پر قیامت گزر گئی۔

میرا دل آپ کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ وہ جھجکتے ہو بولی۔



مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

کس گناہ کی پاداش میں؟ میں نے چائے کا کپ تپائی پر رکھ دیا۔

بھابی جان نے کہا تھا کہ آپ مجھ سے اس لیے شادی کر رہے ہیں کہ بھائی جان کے پاس میرے جہیز کے لیے رقم نہیں تھی۔

یہ تم سے خالہ جان نے کہا تھا؟ میں غصے سے کھول اٹھا۔

جی۔ وہ کچھ ڈر سی گئی۔

اب کیا انہوں نے صفائی میں خط لکھا ہے؟ (اسکے بدلے ہو رویے کے سبب یہ سوال کرنے کا جواز تھا)

نہیں۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

پھر۔۔۔؟

آپ کے اظہار محبت نے خود ہی اصلیت آشکارا کر دی۔ وہ شرگیں مسکراہٹ سے گویا ہوئی۔

ہیں۔۔ مجھے اپنا کوئی خاص عمل یاد نہ آیا (البتہ اسے پانے کے سفر کی کہانی انہی دنوں اسے سنا ڈالی تھی)

جب مجھے شام کو آپ گجرے پہناتے تھے۔ تو آپ کے جذبوں کی ایک ایک لہر میرے وجود میں اتر جاتی تھی۔ پھول پہنانا انہیں ہی یاد رہتا ہے جو کسی کو بہت یاد رکھتے ہوں۔ مجھے ایک دن خود بخود احساس ہوا کہ جیسے بھابی جان نے مجھ سے غلط بیانی کی ہو۔ معاف کیجیے گا۔

وہ مجھے دیکھتے ہو کچھ جھینپ کر مسکرائی۔

پھر جب آپ نے پچھلی باتیں بتائیں تو یقین آ گیا کہ۔۔۔معاوہ ایک دم اٹھی۔

یہ دیکھیے۔حالات کتنے نازک ہو گئے تھے۔

اس نے دراز میں سے ایک کاغذ نکال کر میری سمت بڑھایا۔میں نے الجھتے ہو کاغذ پر نگاہ دوڑائی۔

بھابی جان محترمہ

السلام علیکم

خیریت غیر موجود، خیریت مطلوب۔کافی دنوں سے مجھے گھر سے کوئی خط نہیں آیا۔سوچتی ہوں شاید آپ سب نے مجھے بھلا دیا ہے۔بھلا دینے کے عمل میں جاتا ہی کیا ہے۔یہ خط میں بہت مجبوری کی حالت میں لکھ رہی ہوں یقیناً آپ پڑھ کر دکھی ہی ہوں گی۔بھابی جان اس شاہی قلعے میں دم گھٹ جا گا میرا۔آپ نے ترس۔۔۔کھانے والوں سے میری شادی کر کے مجھ سے کس گناہ، کس جرم کا بدلہ لیا ہے۔

یاور کا جو رویہ میرے ساتھ ہے۔اس میں ان کا کیا قصور۔جذباتی فیصلے تو پچھتاوے ہی دیتے ہیں۔

ترس کا جذبہ اتنا طاقت ور تو نہیں ہوتا کہ زندگی بھر کی گری کھینچی جا سکے۔ان



کا سر درویہ مجھے روگ لگا دے گا۔

خدارا مجھے بلا لیجیے۔ورنہ میرا دم گھٹ جا گا۔سب کو درجہ بدرجہ سلام و دعا۔

فقط مینا

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

میں نے مینا کی سمت دیکھا۔اس نے مسکرا کر خط میرے ہاتھ سے لے لیا اور پرزے پرزے کر دیا۔

لیکن قصور تو تمہارا ہے۔تمہارے رویے میں اتنی سرد مہری تھی۔میرے حوصلے کیسے بڑھتے؟

اب مجھے سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔

میں نے تو اپنا رویہ اس لیے سرد کیا تھا کہ آپ مجھ سے وجہ پوچھیں گے تو میں دل کا سارا غبار نکال دوں گی۔کیونکہ مجھے شک سا تھا کہ بھابی جان نے کہیں اپنے طور پر ہی یہ بات نہ کی ہو۔
لیکن جب آپ نے میرے برے رویے کے بارے میں کچھ پوچھا نہیں
تو مجھے یقین آنے لگا تھا۔آپ خود ہی سوچیے کیا یہ کسی لڑکی کے لیے باعث توہین نہیں کہ اس پر ترس کھا کر اپنایا جا۔کیا اس میں کوئی ایسی صلاحیت نہیں کہ وہ کسی کی زندگی میں اہم کردار ادا کر سکے۔

لیکن آپ کے گذشتہ دنوں کے رویوں نے آپ کا خلوص ظاہر کیا اور انہی لمحوں میں بہت خوبصورت انکشاف بھی ہوتو۔۔۔

تم مجھے موقع تو دیتیں۔ یہ انکشاف تو بہت شروع میں ہو جاتے تم پر۔ میں نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ وہ شرما گئی۔

تم نے تو مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور سنو تم سے یہ بات خالہ جان نے شادی سے پہلے کہی تھی۔ یا بعد میں؟ میں نے پوچھا۔

پہلے کہی ہوتی تو شاید میں شادی سے ہی انکار کر دیتی۔ وہ آہستگی سے مسکرائی۔

ہاں بھئی، بہت دبنگ ہو تم، جانتے ہیں۔ میں نے چھیڑا۔

او خدا یہ کیا ہونے جا رہا تھا۔ میرا دل دہل گیا۔

برصغیر بلکہ دنیا میں یہ نازک رشتے کیا کیا گل کھلا سکتے ہیں۔ مجھے خالہ جان سے سخت شکایت پیدا ہو چکی تھی۔ انہوں نے حسد میں یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ اپنی نند کا نہیں بلکہ اپنے بھانجے کا بیڑا غرق کرنے چلی تھیں۔ اس بحران سے نکلنے پر میرا دل خدا کے حضور سجدہ شکر بجا لا رہا تھا۔

(مجھے کیا خبر تھی کہ میں اپنی انا اور وہ غلط فہمی میں سلگ رہی تھی)

پھر مجھے وہ نیلی آنکھیں کہیں نہیں ملیں۔ کہیں نظر نہ آئیں۔

ایک روز چورنگی پر ایک نوجوان لڑکا گجرے بیچ رہا تھا۔ میں نے اس بچے کے بارے میں اس سے دریافت کیا۔ اس نے روح فرسا خبر سنائی کہ وہ اسی چورنگی پر ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا ہے۔ سرکار نے اس کے گھر والوں کو معاوضہ دلایا ہے۔ وہ پکے گھر میں چلے گئے ہیں۔ اس کی ماں نے گھر میں ہی پرچون کی دکان کھول رکھی ہے۔ بعض انسانوں کی موت بھی کتنی



فیض رساں ہوتی ہے۔ دکھ سے میری آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔

اسے دیکھ کر ایک بار میں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا۔ اے اللہ تو تو مجھ سے زیادہ ہزار گنا زیادہ محبتوں کا تقسیم کار ہے۔ اس بچے کا کیا مصرف ہے اس دنیا میں؟ کیا یہی کہ آلام کے لاؤ میں دہکتا رہے۔ خوشامدیں کر کے پھول بیچتا رہے؟

میرے ضمیر کے گنبد میں کلام حق کے الفاظ گونجے کہ اللہ نے کوئی شے بلاوجہ نہیں بنائی۔ مجھے اپنے گھر کے در و دیوار روشن دکھائی دیے۔ جس کا سبب وہ معصوم مرحوم تھا۔

کیا تمہیں اس کی قبر کا پتا ہے؟ میں نے لڑکے سے دریافت کیا۔

جی صاحب وہ ہمارے محلے میں رہتا تھا۔ آپ چلیں گے؟ اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔

ہاں۔ چلو۔

میں نے دوسری سمت کا دروازہ کھولا۔ گجروں سے ایک گلاب کسی دن ٹوٹ کر ڈیش بورڈ پر پڑا رہ گیا تھا۔ قبرستان میں گاڑی روکتے ہوئے میں نے وہی گلاب مرقد پر رکھنے کے لئے اٹھا لیا۔

اختتام---------------The End